ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

تنقید اور "مطالعاتِ تنقید"

ڈاکٹر عبدالرحیم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج سول لائنز، لاہور
ڈاکٹر فوزیہ شہزادی
سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، لاہور
عاطف منظور
لیکچرر اُردو (وزٹینگ)، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Dr. Abdul Raheem
Assistant Professor, Department of Urdu,
Govt. Islamia Graduate College Civil Lines, Lahore
Dr. Fouzia Shahzadi
School Education Department, Lahore
Atif Manzoor
Lecturer Urdu (Visiting) University of Education, Lahore

Abstract:
Dr. Muhammad Amjad Abid is a prominent name in the field of Urdu language, literature, and criticism. He has made significant contributions through his critical essays and scholarly works. His book Mutaliat-e-Tanqeed serves as an essential text in literary criticism, encompassing discussions on the nature and scope of criticism, its various movements, contemporary literary consciousness, and analytical studies of works by renowned critics. This article critically examines Mutaliat-e-Tanqeed, providing an insightful evaluation of its themes, methodology, and impact on Urdu literary criticism. It highlights the book's scholarly depth and its contribution to fostering a nuanced understanding of criticism in the context of Urdu literature.

Keywords: Criticism, Literature, Research, Critical Consciousness, Contemporary Consciousness, Globlization, Culture, Colonialism

کلیدی الفاظ: تنقید، ادب، تحقیق، تنقیدی شعور، عصری شعور، عالمگیریت، ثقافت، استعمار

کیا تنقید کا تعلق صرف اور صرف ادب سے ہے یا یہ عملی زندگی کے شعبوں میں بھی کار آمد ہو سکتی ہے؟ اس سوال کی جڑیں اور جہتیں بہت سی ہو سکتی ہیں اور یہ زندگی کے کئی شعبوں سے انسلاک کا باعث بھی ہیں۔ تنقید کا تعلق اس مشاہدے سے ہے جس کے پس منظر میں بہتر سے بہترین نظر آنے یا دکھائی دینے کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ اکثر سرکاری دفاتر اور گھروں میں کپڑوں کی الماری کے ساتھ قدِ آدم یا اپنی توفیق و استطاعت کے مطابق آئینہ نصب کیا ہوا تقریباً سبھی نے دیکھا ہو گا جس کا بنیادی مقصد گھر سے یا دفتر سے کسی کام کے لیے باہر نکلتے ہوئے اپنے لباس اور صورت کا تنقیدی جائزہ بھی لینا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی کمی کوتاہی ہنسی، مذاق، تضحیک یا استہزا کا باعث نہ بنے۔ اس نوعیت کا تنقیدی شعور ہمیں عملی زندگی میں دیگر بہت سے مواقع پر بھی نظر آتا ہے۔ خواتین و حضرات کپڑوں کی خریداری میں رنگ اور قیمت دونوں کو مد نظر رکھتے ہیں۔ اسی طرح روز مرہ زندگی میں اشیائے خورد و نوش کا انتخاب کرتے ہوئے اس کے درست ہونے کے اندازے کے ساتھ ساتھ بھاؤ تاؤ کرتے ہوئے بھی ہم تنقیدی شعور کو بروئے کار لاتے ہیں۔ یہاں تک کہ محبوب سے غمِ دل کی وضاحت کرنے کے لیے بھی حاشیے کی ضرورت پڑ جاتی ہے بقول سلیم ساگر:

؎ کسی کم فہم کی جانب مرا رُوئے سخن تھا سو
]] غمِ دل کی وضاحت کی لگا کر حاشیہ میں نے(۱)

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

تنقید کے ساتھ تحقیق بھی ہماری روز مرہ زندگی میں کام آتی ہے۔ کسی جوتوں کی دکان سے جوتے کی خریداری میں جوتے کی شکل وصورت، اس کے چمڑے سے متعلق بنیادی نوعیت کی معلومات، اس کے آرام دہ ہونے کے اندازے تو تنقید کی ذیل میں رکھے جاسکتے ہیں اسی طرح کی معلومات کہ وہ پاپوش کس کمپنی نے بنائے ہیں، اس کا تعلق کس ملک سے ہے، اس کی خدمت کا دائرہ کار کتنے عرصے پر محیط ہے، کارپوریٹ مارکیٹ میں اس کی ساکھ سے متعلق عوام وخواص کی آرا کیا ہیں؟ یہ اور اس نوع کی سبھی باتوں کا تعلق کسی نہ کسی طرح تحقیق کی قلمرو سے علاقہ رکھتا ہے۔ کسی ڈاکٹر کا مریض کی بیماری سے متعلق پس منظری تاریخ کا جاننا یا کسی شخص کا کسی جرم سے متعلق تفتیش کا عمل بھی تحقیق میں شمار کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ والدین اپنے بچوں اور بچیوں کی نسبت طے کرتے وقت جو جانچ پرکھ کرتے ہیں اس کا تعلق بھی تحقیق سے بنتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ”جب آپ اپنی بہن یا بیٹی کا رشتہ طے کرتے ہیں تو پہلے لڑکے کے بارے میں تحقیق کر کے اصل حقیقت کو تلاش کرتے ہیں تاکہ اصل حقیقت اور سچائی کو معلوم کر کے جو رائے آپ قائم کریں یا جو فیصلہ آپ کریں وہ ہر طرح صحیح و درست ہو۔ یہی کام زندگی کی ہر سطح پر تحقیق کا ہے۔ یہ تحقیق خواہ آپ بہن، بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں کر رہے ہوں یا سائنس، الیکٹرونکس، طبیعیات یا ادبیات کے بارے میں کر رہے ہوں، طریقۂ کار مختلف ہونے کے باوجود اس کی نوعیت ایک سی ہوتی ہے۔ یعنی بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش اور اصل شکل میں حقیقت اور سچائی کی تلاش۔ منزل ایک ہوتی ہے۔ راستے اور مقاصد الگ الگ ہوتے ہیں۔“(۲)

مذکورہ بالا گفتگو کا مطمع نظر یہی ہے کہ تحقیقی و تنقیدی شعور ایسے رویے ہیں جن کا تعلق محض ان افراد سے ہرگز نہیں جنھوں نے سندی تحقیق کی ڈگریاں لے رکھی ہوں۔ یہ شعور تب بھی موجود تھا جب یہ ڈگریاں ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ تب بھی لوگ اسے بروئے کار لا کر زندگی کے محاسن کو بہتر جبکہ معائب کو دُور کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ جس طرح عصرِ حاضر میں صوفیائے کرام کو پڑھے بغیر پنجابی زبان میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل نہیں ہو سکتیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ صوفیائے کرام کن یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل تھے؟ بات کی تمہید بہت طولانی ہو چکی ہے اس لیے قصہ مختصر یہی ہے کہ تحقیقی و تنقیدی شعور ڈگریوں کے حصول کے علاوہ بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے اور ڈگریوں کے ساتھ بھی لوگ اس سے دست کش ہو سکتے ہیں۔

جس طرح تنقید تحقیق کے بغیر ادھوری ہے اُسی طرح یہ تخلیق کے بغیر بھی مکمل ہونے کا تصور نہیں کر سکتی۔ یوں یہ تخلیقی عمل نہ صرف جدت لانے کا باعث بنتا ہے بلکہ اسے فن کے درجۂ کمال تک پہنچانے کی بھی سعی کرتا ہے۔ اس طرح تنقید ماضی کا شعور، حال سے آگہی اور زمانۂ استقبال کے ادراک سے متصف بھی ہو جاتی ہے۔ ایسی تنقید کی مثال اُس دریا کی مانند ہو جاتی ہے جو سنگلاخ پہاڑوں، تنگ و تاریک ندیوں، منہ زور نالوں سے نکل شاداب و زرخیز میدانوں کو گل و گلزار بنانے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے جو قارئین کو آگہی کی دولت اور شعور کے خزانوں سے مالا مال کر دیتی ہے۔ جہاں اسلوب میں شائستگی، بات میں وضع داری اور فن پاروں کو سراہنے کے ساتھ ان کے معائب کی جانب ہمدردانہ انگشت کشائی کرتی نظر آتی ہے۔ جس سے قارئین کے ساتھ تخلیق کاروں کی بھی تربیت ہوتی ہے۔ تنقید اور تخلیق کے باہمی تعلق کے ضمن میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

> ”ہم جب تنقید کی بات کرتے ہیں تو بالعموم اُسے ایک ایسی صلاحیت قرار دیتے ہیں جو تخلیق سے مختلف ہوتی ہے۔ فنون کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں کسی شے کے حسن و قبح جاننے کے لیے ہمیں ماہرین کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عمارت کے بارے میں ماہر تعمیرات اور پل کے بارے میں انجینئر کی رائے طلب کی جاتی ہے۔ مگر فنون کے ناقد وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو خواہ خود فن کار نہ ہوں مگر فنی ذوق اور تربیت سے اس قابل ہوں کہ اس پر تنقید کر سکیں۔۔۔۔ ہمارے عہد میں ناقدوں کی ایک جماعت موجود ہے جو خود تو تخلیق نہیں کرتے لیکن تخلیقی فن پاروں پر تنقید کرتے ہیں اور فن کے ناقد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ناقدوں کی یہ جماعت کافی بڑی ہے اور ہم انھیں یہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے کہ 'بگڑا شاعر ناقد' اس بات میں بھی کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ تنقید اور تخلیق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ تخلیقی صلاحیت 'ترکیبی' (Syanthetic) اور 'تجزیاتی' (Analytic) ہوتی ہے۔ اس کے باوجود تنقید اور تخلیق کو مختلف

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

خانوں میں تقسیم کرنا اور ان ناقدوں اور فن کاروں کے لیے علیحدہ علیحدہ منصب کا تعین اس طرح کرنا کہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ممیز ہو جائیں، مناسب نہیں ہے۔"(۳)

تنقید کا وظیفہ ادبی فن پاروں میں موجود امکانات کی کھوج لگانا ہے اور اس کے ساتھ اُس کی خوبیوں کو زیر بحث لا کر اُن کی نشاندہی بھی کرنا ہے جو اُس فن پارے کی عظمت کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ تنقید کے اِسی قضیے کے سلسلے میں آل احمد سرور تحریر کرتے ہیں:

"تنقید کو عام طور پر دوسرے درجے کی چیز سمجھا گیا ہے۔ علی گڑھ میں میرے ایک کرم فرما ہیں جو کوئی تنقید پڑھتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ 'یہ بات کیا ہوئی؟ کچھ اشعار لکھے، کچھ انکا خلاصہ بیان کیا، افتتاحی الفاظ یا حواشی بڑھائے اور تنقید تیار ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی رسالوں میں ایسی تنقیدیں کثرت سے ملتی ہیں مگر تنقیدِ محض اس کا نام نہیں۔ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں طویل طویل اقتباسات اس لیے دیے تھے کہ مرثیوں کی خوبی کا اندازہ دو ایک بندوں سے نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ غرض تنقید کو دوسرے درجے کی چیز سمجھنا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وُہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ، ماہر نفسیات، ایک شاعر، ایک پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"(۴)

"مطالعاتِ تنقید" ڈاکٹر محمد امجد عابد کی نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد سے حال ہی میں منصۂ شہود پر آنے والی کتاب ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور میں شعبہ ادبیات کے اُستاد ہیں۔ جہاں تک اُن کی اس کتاب کا تعلق ہے تو یہ ڈیلکس ایڈیشن میں ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو سہولت کے لیے چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ تقریباً ۱۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جن میں اس کتاب پر دو تبصرے ہیں جو "حرفے چند" اور "امجد عابد کی اولین کتاب" کے عنوان سے بالترتیب ڈاکٹر محمد اصغر یزدانی اور ڈاکٹر عبد الکریم خالد نے تحریر کیے ہیں۔ یہ جائزے اس کتاب کا بھرپور تعارف کرواتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اصغر یزدانی گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج سول لائنز لاہور میں شعبہ ادبیاتِ اُردو کے اُستاد ہیں۔ وہ جہاں فنونِ لطیفہ پر گہری نظر رکھتے ہیں ویسے ہی وہ تنقید کے نظری اور عملی پہلوؤں کو جانچتے پرکھتے ہیں۔ اُن کی گفتگو اور تحریر دونوں یکساں انداز میں دلکش و دلآویز ہوتی ہیں جو بالترتیب سامعین و قارئین کے لیے فردوسِ گوش اور فن پارے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی رائے ملاحظہ کیجیے:

"ڈاکٹر امجد عابد وسیع المطالعہ ادیب، دقیقہ سنج محقق اور عمدہ نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ کشادہ دل، وسیع النظر اور صاحب الرائے انسان ہیں۔ انھی اوصاف کی بدولت ان کی تحریر میں تنقید میں غیر جانبداری اور قطعیت کی خوبی ہر جگہ نمایاں ہے ..... 'مطالعاتِ تنقید' میں انھوں نے ناقدین کے فن کا تجزیہ کرتے وقت ان کے ذہنی اور معاشرتی رجحانات اور اساسی تصورات کے ساتھ ساتھ ان کے احساسات و میلانات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔"(۵)

ڈاکٹر عبد الکریم خالد ادبیاتِ اُردو کے زیرک اُستاد، کہنہ مشق نقاد، موثر تخلیق کار اور باریک بیں قاری کی حیثیت سے منفرد مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ اُن کی تحاریر سے جہاں ادب کے طلبا استفادہ کرتے ہیں وہاں اساتذہ بھی فکر و فن کے تناظر میں نئے نئے خیالات کی خوشہ چینی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی کتاب کے محاسن کو اُجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبد الکریم خالد کا کہنا ہے کہ:

"امجد عابد نے اپنی دانست میں جو انتخاب کیا ہے اس کے ذریعے اردو تنقید کا جدید منظر نامہ بہت صاف اور روشن ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ انھوں نے اس امر کا لحاظ کیے بغیر کہ کون سا مال زیادہ بکنے والا ہے اور کون بھاری بھر کم حوالوں سے لدا پھندا ہے، اپنے علم و دانش اور بصیرت پر بھروسہ کر کے اور ریجنل سوچ رکھنے والے نقادوں کو اہمیت دی ہے اور پامال رستوں سے ہٹ کر نئے امکانات کی نشان دہی کی ہے۔"(۶)

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

انسان اپنے ارد گرد کی دُنیا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی تخلیقات میں جہاں حالات و واقعات کا عکس جلوہ گر ہوتا ہے وہاں عصرِ حاضر کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے جس کی بدولت وہ تخلیقات کی دُنیا میں نئے سے نئے موضوعات پر قلم فرسائی کرتا ہے جو قارئین کی تربیت کا باعث بھی بنتا ہے۔ ڈاکٹر محمد امجد عابد اس کتاب کے پیش لفظ بعنوان ''حرفِ آغاز'' میں کچھ یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

> ''موجودہ دور اپنی حشر سامانیوں، ہنگامہ طرازیوں اور کرشمہ سازیوں کے سبب تاریخ کا عدیم المثال دور ہے جس میں انسان ایسے خطرناک قسم کے مسائل سے دوچار ہے جنھوں نے اسے خود اس کی اپنی بقا کے مسئلے سے دوچار کر دیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا کلیدی نقطہ عصری شعور ہے جو ہمیں نہ صرف ان مسائل کو سمجھنے کے لیے ایک راہِ عمل کا پتہ دے گا بلکہ ادب کے تعلق سے ان مسائل کے ممکنہ حل کی طرف پیش رفت میں بھی معاون ثابت ہو گا۔''(۷)

''مطالعاتِ تنقید'' کا دوسرا حصہ ''اُردو تنقید: ادبی اور تاریخی پس منظر'' کے عنوان سے منسوب ہے جو کتاب کے ۶۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس میں شامل مضامین کی تعداد ۰۸ ہے۔ اس حصے میں شامل مضامین نہ صرف اُردو تنقید کے ابتدائی خدوخال اور اس کے نقوش نمایاں کرتے ہیں بلکہ بہت واضح انداز میں تنقید کے پروان چڑھنے تک اور اُس کی موجود صورتِ حال کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ جنھیں پڑھنے سے جہاں تنقید کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہاں اس کے رجحانات کے ادراک میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ میری ان باتوں کی تصدیق اس حصے میں شامل مضامین کے عناوین سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہاں اُن کو بیان کر دینے میں کوئی مضحکہ نہیں ہے۔ اس حصے میں شامل مضامین کچھ یوں ہیں: ''تنقید اور ادبی تنقید: معنی و مفہوم، اُردو تنقید، تذکرہ نگاری اور آبِ حیات، عصری شعور کی اصطلاح اور اُردو تنقید، حالی اور شبلی کی تنقیدی جہات، رومانوی تنقید، ترقی پسند تنقید: ماضی، حال اور مستقبل، ترقی پسند تنقید اور عصری شعور اور حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید''۔ یوں یہ عنوانات واضح کرتے ہیں کہ تنقید کی موجودہ صورت کن کن رجحانات کے سنگِ میل طے کرنے سے ترتیب و تشکیل پاتی ہے جن کے ادراک سے تنقیدی شعور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ ''جدید اُردو تنقید نگار'' سے متعلق ہے۔ اس حصے نے کتاب کے ۱۲۲ صفحات کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جب کہ اس میں شامل مضامین کی تعداد ۱۵ ہے جن کے عنوانات درج ذیل ہیں: ''ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تنقید نگاری، انتظار حسین کا تنقیدی شعور، ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی نظریات، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی تنقید کے اساسی پہلو، انیس ناگی بحیثیت نقادِ ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کے فکری زاویے، محمد علی صدیقی کا اندازِ نقد، جدید اردو تنقید کا ایک معتبر حوالہ: تبسم کاشمیری، ڈاکٹر عبد الکریم خالد کا حاسۂ تنقید، ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف کا شعورِ نقد، ڈاکٹر محمد خاں اشرف کا تنقیدی شعور، ڈاکٹر سید قاسم جلال کی تنقید نگاری، نثار ترابی کے تحقیقی و تخلیقی زاویے، ڈاکٹر محمد کامران: عہدِ حاضر کا نمایاں نقاد اور مکتبۂ معروضی نقد و نظر کا فکری نمائندہ: اظہر غوری''۔ یہ عناوین بھی اس بات کے غماز ہیں کہ دورِ حاضر کے ان اساتذہ سے اکتساب فیض کیے بغیر تنقید کے نظری اور عملی پہلوؤں پر دسترس کا دعوی قابل تردید ہو سکتا ہے۔

ان متذکرہ بالا مضامین میں صاحبِ کتاب نے جہاں استادانِ فن کی تنقیدی جہات پر روشنی ڈالی ہے وہاں اُن کے رجحانات کو بھی نمایاں انداز میں بیان کیا ہے۔ اس طرح اُردو کے نمائندہ نقادوں کے نہ صرف رویے سامنے آتے ہیں بلکہ ان کے شعور سے دورِ حاضر کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں بھی خاطر خواہ مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تنقیدی تحریروں پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد امجد عابد لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تنقیدی تحریروں میں عصری صداقتوں سے شعوری طور پر ہم رشتہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُن کے یہاں نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر کی تحسین لازم ٹھہرتی ہے کیوں کہ ایک عہد کی سچائی دوسرے عہد کی سچائی سے روایت کے تسلسل میں جڑ جاتی ہے اور زمانے کا ذوق کسی ایک مرکز پر آکر اس مقصدیت کو اپنا مرکز بنالیتا ہے جو نئے ادب کا تقاضا ہے۔''(۸)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی طرح ڈاکٹر سجاد باقر رضوی بھی معلم ادبیات اُردو ہونے کے بناتے سے زبان، تحقیق اور تنقید پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اُردو میں طلبا و طالبات کی ایک کثیر تعداد کو اُن کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے تنقیدی نظریے پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد امجد عابد کہتے ہیں:

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

> ”سجاد باقر رضوی کی تنقید کے مطالعے سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسروں کے نظریات و تصورات پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھنے کی بجائے اپنے نظریاتی اصول خود وضع کی کیے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اُنھوں نے روایتی شعورِ تنقید کو مسترد کر کے نئے تنقیدی تجربات کی بنیاد رکھی۔ روایت اور تجربے کی دُوئی کے وہ نہ تخلیق میں قائل ہیں اور نہ تنقید میں۔ البتہ اُن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہر تخلیق کار کی قدر و قیمت کا تعین تنقید کے ایک جیسے پیمانوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے یہاں ہر نئے دور کی تخلیق روایتی شعورِ تنقید میں تبدیلی کا تقاضا کرتی ہے۔“(۹)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تنقید، تحقیق، تخلیق اور تدریس کے دشت میں قریباً نصف صدی سیّاحی کی ہے۔ عہدِ موجود کئی نسلیں نہ صرف اُن سے فیض یاب ہو چکی ہیں بلکہ کُھلے بندوں اُن کی خدمات کا برملا اظہار بھی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی عرق ریزی اور ریاضت کی بنیاد پر اُستادِ کامل کے درجہ پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے تنقیدی نظریات پر بات کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ”تبسم کاشمیری ایک اہم نقاد ہیں جنھوں نے اپنی تنقید میں جس ادبی شخصیت یا ادب پارے کا مطالعہ کیا اُسے خاص طور پر عصری آئینے میں رکھ کر اپنے عہد کے طرزِ احساس کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی تنقید اپنے عہد کی عصری آگہی اور شعور سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ وہ بنیادی طور پر ارضیت کے قائل ہیں اور اسی لیے مافوق الفطرت صورتِ حال سے گریز کی راہ اختیار کر کے اپنے عہد اور زمانے کی سانسوں سے سانسیں ملا کر چلنے کے قائل ہیں۔“(۱۰)

ڈاکٹر محمد کامران عصرِ حاضر کے نمایاں اور اہم نقادوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ بھی اورینٹل کالج، یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور کے ادارہ زبان و ادبیاتِ اُردو کے اور ڈین کی حیثیت سے اہم عہدے پر فائز ہیں۔ ان کا تحقیقی و تنقیدی سرمایہ کئی شعبوں اور کتب کو محیط ہے جس سے نہ صرف تربیت بلکہ بالغ نظری کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اُن کے تحقیقی اور تنقیدی اثاثے پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد امجد عابد کا موقف ہے کہ:

> ”ڈاکٹر محمد کامران کی تخلیقی جہتیں دھنک کے رنگوں کی مانند ہیں جو نہ صرف خوب صورت بلکہ دلکش اور منفرد بھی ہیں۔ اُن میں کہیں تحقیق کی جھلک ہے تو کہیں تنقید نے افسانے کے فہم میں اپنا کردار ادا کر کے ادبی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ کہیں تخلیقیت اور ادبیت نے فصاحت و بلاغت سے قارئین کے دلوں میں جہاں اُردو کی اہمیت بڑھا دی ہے وہاں ایک طبقے کو اُن کی علمی و ادبی کاوشوں کا غائبانہ معتقد بھی بنا دیا ہے۔“(۱۱)

مطالعاتِ تنقید کا چوتھا حصہ ”تحقیقی و تنقیدی مطالعات“ کے عنوان سے تشکیل دیا گیا ہے جس نے کتاب کے ۴۲ صفحات کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اس میں ۰۶ مضامین شامل ہیں جن میں ”استعماری بیانیوں کی تفہیم اور جدید اُردو تنقید، قومی ثقافت کی تشکیل: اُردو ادب اور عالم گیریت، عالم گیریت اور اُردو رسم الخط، جدیدیت: سر سید احمد خان اور عصرِ جدید کے تقاضے، عبادت بریلوی کی میرؔ اور غالب شناسی اور عبد اللہ حسین کی فکشن میں عصری شعور“ کو جگہ دی گئی ہے۔ اکیسویں صدی قدیم و جدید کا وہ حسین سنگم ہے جہاں ماضی کی روایت اور زمانہ استقبال کی جدت پسندی نے حال کے ذریعے سے اپنی کڑیوں کو باہم مربوط کر رکھا ہے۔ گلوبلائزیشن نے جہاں انسانی اقدار کے خدوخال کو متاثر کیا ہے وہاں تحقیق، تنقید، تخلیقی اور ادبی روایات بھی اس سے اثر پذیر ہوئی ہیں۔

برصغیر میں اگرچہ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء۔۱۹۴۷ء تک باقاعدہ حکومت تقریباً ۹۰ برس کی ہے لیکن ان کے اثرات سے برصغیر کے نوزائیدہ ممالک بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کبھی بھی آزاد نہ ہونے پائے۔ وہ بظاہر جا چکے ہیں لیکن یہاں کی حکومتیں کسی نہ کسی طرح اُن کی نادیدہ ڈوریوں سے اب بھی بندھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح اُردو تنقید اب بھی انگریزی تنقید کے زیر اثر ہے۔ نامور نقادوں کی تنقیدی کتب اور مضامین میں اُنھی کے خیالات اور نظریات کی روشنی میں براہِ راست یا قدرے ہٹ کر وہی باتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایسے ہی موضوعات کی بازگشت اس حصے کے مضامین میں سنائی دیتی ہے۔ یہاں عالم گیریت کے زیر اثر قومی ثقافت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

عالم گیریت جہاں اُردو ادب اور اس کے رویوں کو متاثر کرنے کا باعث بنی ہے وہاں اس نے ثقافت پر بھی اپنے گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں۔ تہذیب، ثقافت اور کلچر ایک چیز ہی کے مختلف نام ہیں جبکہ تمدن دوسری چیز ہے۔ لغات، ڈکشنریوں اور انسائیکلوپیڈیاز میں ان کی تعریفات کی وہ بھرمار ہے کہ

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

انسان اُنہی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ عام فہم الفاظ میں عرض ہے کہ تہذیب، ثقافت اور کلچر کسی بھی معاشرے کی ترقی کے لیے بنائے ہوئے اصول وضوابط کو کہا جا سکتا ہے جن کے بغیر معاشرہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس کی مثال کسی بھی مکان بنانے کے نقشے سے دی جاسکتی ہے کہ جس میں سادہ کاغذ پر اس مکان کے حصے، منازل، کھڑکیوں اور اس نوع کے دیگر منصوبوں کو دکھایا جاتا ہے جبکہ تمدن اُسی نقشے کو مد نظر رکھ کر تعمیر کردہ مکان کو کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح تمدن، تہذیب، ثقافت اور کلچر کے اصولوں پر پیش قدمی کرتے ہوئے ترقی یافتہ معاشرے کا نام ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر محمد امجد عابد قومی ثقافت کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

> ”قومی ثقافت دراصل قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کے لیے ایک بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ قومی یک جہتی معاشی عدل اور معاشرتی مساوات سے جنم لیتی ہے اور ایک ایسی فضا میں سانس لیتی ہے جس سے مختلف علاقے ایک دوسرے سے پیوست ہو کر ایک قوم بنتے اور ایک اکائی کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ قومی ثقافت کسی قوم کی شناخت کو ظاہر کرنے کا باعث بنتی ہے اور اس میں باطنی سطح پر کئی ایک اکائیاں کام کر رہی ہوتی ہیں جو الگ الگ سطح پر اپنی شناخت قائم کرنے کے ساتھ مجموعی قومی دھارے میں بھی شریک ہوتی ہیں اور اپنے اپنے علاقوں کے تہذیبی اور فکری ماحول کا ایک ڈھانچہ تیار کر کے بہ حیثیت مجموعی قومی روح کا اظہار کرتی ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ قومی ثقافت دراصل قومی تشخص ہی سے ترتیب پاتی ہے اور لفظوں کے تفاوت کے باوجود بہ باطن ایک ہی طرح کے طرز عمل اور ایک ہی طرح کی تخلیقی توانائیوں سے مرتب ہوتی ہے۔ پاکستان کے جغرافیائی حدود اربعہ اور اس میں رواج پانے والی مختلف علاقائی ثقافتوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان سب میں ایک قدر مشترک نظر آئے گی وہ اس ثقافت کا چہرہ ہے جس کے خدوخال ہماری دینی روایات اور مذہبی تاریخ سے متعین ہوتے ہیں۔ اسی کو ہم قومی ثقافت کا نام دیتے ہیں۔“(۱۲)

اکیسویں صدی کے بدلتے تقاضوں میں جہاں بہت سی چیزیں تبدیلی کے عمل سے گزری ہیں وہاں تہذیب وثقافت اور تمدن بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کا اثر ہماری قومی وثقافتی زندگی پر بھی پڑا ہے۔ اس کے ساتھ اُردو زبان کے رسم الخط میں بھی واضح تبدیلی آئی ہے۔ انٹرنیٹ، موبائل اور سوشل میڈیا وہ تین بنیادی اکائیاں ہیں جنھوں نے نسل نو کو قومی معاملات کے ساتھ بین الاقوامی مسائل سے بھی آگاہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ قومی چینلز کے جھوٹ کا پول آن واحد میں کھول کر بدعنوان اربابِ اختیار کو انگشت بدنداں کر دینے کی صلاحیت سے بھی مزین ہیں۔ اس کے ساتھ ایس۔ ایم۔ ایس ٹائپ کرتے ہوئے وہ اُردو کو رومن حروف میں لکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ عالم گیریت نے انسانی رویوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کے لکھنے کے انداز میں جو واضح تبدیلی کی ہے وہ وقت کی ضرورت تو ہے لیکن زبان کے صحیح خدوخال کو اُجاگر کرنے کے لیے اُسے اُردو حروفِ تہجی میں فروغ دینا چاہیے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد امجد عابد لکھتے ہیں:

> ”عالم گیریت نے اپنے دیگر اثرات کے علاوہ اُردو زبان کو ایسی جدید اصطلاحات استعمال کرنے پر مجبور کر دیا جن میں سے اکثر کو ہم ترجمہ کیے بغیر من وعن استعمال کرتے ہیں۔ بعض اصطلاحات تو ایسی ہیں جنھیں ہم آسانی سے ترجمہ کر کے اُردو کے مزاج کے قریب لے آتے ہیں۔ مثلاً گلوبلائزیشن کو ہم عالم گیریت کہہ لیتے ہیں، کریٹی سیزم کو تنقید میں بدل لیتے ہیں، سمبل ازم کو علامت نگاری کہہ لیتے ہیں۔ اسی طرح بعض اور اصطلاحات بھی ہیں جن کے ترجمے میں ہمیں دقت پیش نہیں آتی لیکن بعض انگریزی الفاظ مثلاً کمپیوٹر، انٹرنیٹ، سیل فون، ویب سائیٹ وغیرہ کو ہم جوں کا توں استعمال کرتے ہیں۔۔۔۔ عالم گیریت کے زیر اثر ہم دُنیا سے رابطے میں ضرور کام یاب ہوئے ہیں۔ ہمیں دور دراز کے ملکوں تک رسائی حاصل ہوئی۔ وہاں کے لوگوں کے مزاج، عادات و اطوار اور رسوم و رواج سے واقف ہوئے، رسل و رسائل میں بہت آسانیاں پیدا ہوئیں، یہ سب کچھ اپنی جگہ پر دُرست لیکن ہم اس عمل میں خود سے کتنا دور ہو گئے اس کی شاید ہمیں بالکل خبر نہیں؟“(۱۳)

عالم گیریت نے معاشرے کی ہر چیز کو تبدیلی کے عمل سے گزار کر اُن پر جدت کا جامہ چڑھا دیا ہے۔ اس سے جہاں کھانا پینا، نشست وبرخاست، لین دین، کاروباری اور تجارتی سرگرمیاں انقلابی تبدیلیوں سے گزری ہیں وہاں زبان کے ساتھ تفریح کے انداز بھی بدلے ہیں۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

اس حصے کے آخری دو مضامین میں عبادت بریلوی کی میر اور غالب شناسی پر سیر حاصل بات کی گئی ہے۔ مزید بر آں آخری مضمون عبد اللہ حسین کی فکشن میں عصری شعور میں عہدِ حاضر کے اس نمائندہ افسانہ وناول نگار کی تحریروں میں موجود عصری شعور کی کڑیوں کو ملاتے ہوئے اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس طرح اُن کی تحاریر عصری شعور کی روشنی سے مالامال ہیں جو انسان کو جینے کے اُصولوں سے نہ صرف واقفیت فراہم کرتی ہیں بلکہ استحصال، ظلم اور زیادتی کے رویوں کو ہدفِ تنقید بھی بناتی ہیں۔ جیسے انسان اپنے حلیے، شکل وصورت، لباس وانداز اور مجموعی تاثر کا جائزہ لیتا ہے ویسے ہی وہ زمانۂ حال اور ماضی کے معاشرے کو مد نظر رکھ کر اُن سے نتائج بھی کشید کرتا ہے اور اپنی زندگی اور اس کے رویوں پر کڑی نظر بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے ڈاکٹر محمد امجد عابد، عبد اللہ حسین کے فکشن کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:

> ''اُداس نسلیں' عبد اللہ حسین کا ایسا شاہ کار ناول ہے جو تاریخی عصری شعور کے حوالے سے ایک زندہ استعارے، ایک روشن علامت کے طور پر ہمیشہ قارئینِ ادب سے دادِ تحسین وصول کرتا رہے گا۔ 'اُداس نسلیں' میں آپ نے قیامِ پاکستان سے قبل کے معاشرتی، سماجی اور سیاسی نشیب وفراز، انگریزی سامراج کی چال بازیوں، ہندوؤں کی مکاریوں سے پردہ اُٹھایا ہے اور انسانی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا بے رحمانہ نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے ذریعے قاری کو برصغیر کی نصف صدی کی تاریخی واقعاتی شہادتوں کی ایک مستند دستاویز دستیاب ہو جاتی ہے۔ اس ناول کے واقعاتی تناظر میں اپنے عہد کی عصری صداقتیں تاریخی شعور کا حصہ بن کر مختلف کرداروں کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں۔ ناول نگار نے اس عہد کے حوالے سے سماجی ٹھیکے داروں کے اصل رویے بے نقاب کیے ہیں۔''(۱۴)

داستانیں، قصے اور کہانیاں ہر دور میں دلچسپی سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ یہ فرصت کے لمحات کو دلکش ودلآویز بنانے کے ساتھ اُن سے غیر شعوری طور پر نتائج اخذ کر کے زندگی میں محبت، اخوت، بھائی چارے اور اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کا جذبہ بھی پروان چڑھاتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنے اعمال و افعال کا جائزہ لے کر اُن پر گرفت نہیں کر سکتا اور انھیں حدِ اعتدال پر لانے سے قاصر ہے تو اس کی تعلیمی ڈگریاں اور اس کے تعلیم یافتہ ہونے کے تمام تر دعوے بے بنیاد، کھوکھلے اور ریت کی گرتی ہوئی دیواروں کی مانند ہیں۔

اس دُنیا میں روزِ ازل سے ابد تک خوب سے خوب تر کی تلاش کا کارواں ہمیشہ سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہا ہے۔ اس میں شامل جن افراد نے چیزوں اور حقائق کو جانچ پرکھ کر آگے بڑھنے کا عمل اپنایا ہے وہ نہ صرف کامیاب ہوئے ہیں بلکہ انھیں مینارۂ نور کی حیثیت حاصل ہے۔ جو لوگ تنقیدی شعور سے مزین رہے ہیں زندگی کی راہیں ایسے افراد سے ہی روشن و درخشاں رہی ہیں جنھوں نے اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا وہ لوگ حرفِ غلط کی طرح تاریخ کے صفحات سے مٹ گئے ہیں۔ تنقیدی شعور نہ صرف زندگی میں مثبت تبدیلی لاتا ہے بلکہ اس کی بدولت انسان دوسروں پر تنقید کرنے کے عمل کو موقوف کر کے خود کو بہتر بنانے کی تگ ودو میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ بقول احمد فرازؔ:

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے(۱۵)

حوالہ جات:

۱۔ سلیم ساگر، آنکھ بھر عکسِ تمنا، لاہور: بک ہوم، فروری ۲۰۰۷ء، ص ۶۲
۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲، ۱۱

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

۳۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، مغرب کے تنقیدی اصول، اسلام آباد، ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۲۱ء، ص ۱۵

۴۔ آل احمد سرور، تنقید کیا ہے؟ مشمولہ: تنقیدی نظریات، مرتبہ: احتشام حسین، لاہور: لاہور اکیڈمی، جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۸، ۲۱۳

۵۔ محمد امجد عابد، ڈاکٹر، مطالعاتِ تنقید، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۲۴ء، ص ۸

۶۔ ایضاً، ص ۱۴، ۱۳

۷۔ ایضاً، ص ۱۶، ۱۵

۸۔ ایضاً، ص ۸۷

۹۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۰۹، ۲۱۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۴۸

۱۵۔ احمد فراز، کلیات احمد فراز، نئی دہلی: فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۰